AL-TABYEEN, [ISSN (P) 2664-1178, (E) 2664-1186 | Jan-Jun-2021, Vol: 5, Issue: 1

اسلامی سلطہ کے قیام پر اقوام غیر مسلم سے معاشرت

(تاریخی و تجزیاتی مطالعہ)

ڈاکٹر محب النبی طاہر*

ڈاکٹر محبوب علی شاہ**

ABSTRACT

Islam is such a unique religion that commoner's social welfare with its subdomains and conquered subjugated principalities. History of Islam is teemed with its practical instances of social welfare with subjugated states. Conquered nations are dealt with and interacted with in a way, that their right might not be violated, instead governing power took such steps that helped them to become acquaintances of the conqueror that is way every Islamic government forbade Muslims to usurp the social rights of any minority the subsequent passage historical and analytical study of sociological dealing of Muslim state with non muslim nations is discussed.

Keywords: اقلیت، دارالسلام، ذمی، دارالحرب، اہل کتاب، تالیف قلب

اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ جس میں فاتح اسلامی حکومت کو اپنے ماتحت اور مفتوحہ اقوام سے حسن معاشرت کا حکم ہے۔ تاریخ اسلام اسکی عملی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ مفتوحہ اقوام کے ساتھ میل جول اور معاملات اس احسن انداز میں وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ کسی بھی غیر مسلم فرد کی حق تلفی نہیں کی جاتی بلکہ تالیف قلب کے لیے حکومت اسلامیہ ایسے اقدام اٹھاتی ہے جس سے اقلیتی طبقات کو مانوس کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اسلامی

* لیکچرر، گورنمنٹ گورونانک کالج، ننکانہ صاحب

** ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ایلیمنٹری سکول مہتہ جھیڈو، بہاولنگر

حکمران کو شریعت اسلامیہ غیر مسلموں سے معاشرت کے اصول وضوابط کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دیتی اور اسلامی سلطنت میں کسی کی حق تلفی بارے سختی سے روکتی ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ عدل ورواداری کے احکام اور مثالیں قرآن کریم، احادیث نبوی، سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں بے شمار موجود ہیں اسلام غیر مسلم رعایا، اقلیتوں کے لیے ہمیشہ سراسر رحمت رہا ہے۔ اس نے ان کو جس قدر حقوق دیئے ہیں وہ ان کو خود اپنی قوم اور ہم مذہب حکومت میں بھی حاصل نہ تھے۔ ان کی حیثیت غلاموں سے بدتر تھی۔ ان کا کام اپنا خون پسینہ بہا کر حاکموں اور جاگیرداروں کے لیے سامان عیش فراہم کرنا تھا۔ ان کو ادنیٰ سی غلطی پر نہایت وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس کی تفصیل کتب تواریخ میں دیکھی جاسکتی ہے، لیکن اسلام سارے طبقات انسانی کے لیے رحمت بن کر آیا، اس نے غیر مسلم رعایا کو بھی اس سے محروم نہیں رکھا اور ان کو اتنے حقوق دیئے جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ اگر ریاست کے مختلف شعبوں اور معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان متوازن ہم آہنگی موجود نہ ہو تو ان میں ایک نہ ایک دن کش مکش پیدا ہونا ناگزیر ہے، پھر یہ بھی لازمی امر ہے کہ اس کش مکش میں بالآخر سارے طبقات تباہ اور سارے گروہ فنا ہو جائیں یا پھر کسی ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر یا ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ پر برتری حاصل ہو جائے۔ دوسرے مذاہب کی تاریخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

انسانوں کے مابین تعلقات دو طرح کے ہوسکتے ہیں۔

- ایک وہ جو وحی کی راہنمائی اور ہدایت کو تسلیم کرتے ہیں۔
- اور دوسرے وہ لوگ جو اس راہنمائی کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور وحی کے بجائے اپنی یا دوسرے انسانوں کی عقل اور مشاہدہ سے ہی کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے تمام لوگوں کو ان لوگوں سے الگ قرار دیا جاتا ہے جو وحی الٰہی کی رہنمائی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور ان حالات میں ایک ہی ریاست کے اندر رہتے ہوئے ان طبقات کے مابین اختلافات، تصادم اور مفادات کے ٹکراؤ کا امکان ہوتا ہے اور اس میں طرح طرح کے تعصبات کے حوالے بھی سامنے آسکتے ہیں جو بظاہر بڑے معمولی اور بڑے بے وقعت ہوں گے، لیکن ان کے نتیجے میں انسانوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا بڑا دشوار ہو گا۔

اسی طرح غیر مسلموں میں سے بعض لوگ کسی وجہ سے اسلامی عقائد کے قریب ہوں گے، بعض بہت دور ہوں گے۔ اگر افراد کی اسلام سے وابستگی یا عدم وابستگی یا لین دین کی بنیاد یہ ہو کہ اس شخص کا یا افراد کا رویہ اسلام کے بارے میں کیا ہے تو اس رویے کی وجہ سے تعلقات کی نوعیت بدل جائے گی۔ اس سلسلے میں فقہائے کرام نے قرآن پاک کی متعلقہ آیات اور احادیث مبارکہ سے راہنمائی لیتے ہوئے قرار دیا ہے کہ اسلامی ریاست یعنی دار الاسلام میں جو احکام جاری ہوں گے وہ ان علاقوں کے احکام سے مختلف ہوں گے جہاں فیصلہ کن حیثیت غیر مسلموں کو حاصل ہے۔ دارالاسلام کے فقہی احکام اس تصور کی بنیاد پر مرتب و مدون کئے گئے کہ وہاں اسلام اور اسلامی شریعت کو بالادستی حاصل ہے۔

امام سرخسی لکھتے ہیں:

" فَإِنَّ دَارَ الْإِسْلَامِ اسْمٌ لِلْمَوْضِعِ الَّذِي يَكُونُ تَحْتَ يَدِ الْمُسْلِمِينَ، وَعَلَامَةُ ذَلِكَ أَنْ يَأْمَنَ فِيهِ الْمُسْلِمُونَ"[1]

"دار الاسلام وہ جگہ ہے جو مسلمانوں کے زیر حکومت ہو، اس کی بڑی علامت یہ ہے کہ وہاں مسلمان محفوظ ہوں۔"

ڈاکٹر عبد الکریم زیدان نے فقہاء کی آراء کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے:

"فالشرط الجوهري لاعتبار الدار دار الاسلام هو كونها محكومة من قبل المسلمين و تحت سيادتهم و سلطانهم فتظهر عند ذاك أحكام الاسلام وليس من شرط هذه الدار أن يكون فيها مسلمون ما دامت الاسلام"[2]

"باعتبار تقسیم دار الاسلام کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس علاقے پر مسلمانوں کی حکومت ہو اور وہ علاقہ ان کی سلطنت کے زیر اثر ہو۔ پس اس طرح وہاں احکام اسلام کا نفاذ ممکن ہو سکے گا۔ اور کسی علاقے کا دار الاسلام ہونے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو جب تک اسلامی حکومت ہو۔"

ڈاکٹر زیدان مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

1۔ سرخسی،ابو بکر محمد بن احمد، شرح السیر الکبیر،دار الکتب العلمیہ ، بیروت، 1997ء، 86:4

2۔عبد الکریم زیدان ، احکام الذمیین و المستامنین فی دار الاسلام، ،مؤسسة الرسالہ ، بیروت 1982ء،ص:18

”دار الاسلام کے باشندوں کو اصلاً تو مسلمان ہونا چاہیے، لیکن کبھی کبھی اس علاقے میں غیر مسلم باشندے بھی ہو سکتے ہیں اور وہ ذمی ہیں۔ اہالیان دار الاسلام کے لیے خواہ وہ مسلمان ہوں یا ذمی ان کے جان و مال کی حفاظت حکومت کا فرض ہے۔ مسلمانوں کے لیے تو ان کے اسلام کی وجہ سے اور ذمیوں کی ان کے ذمی ہونے کے سبب۔ پس وہ تمام لوگ خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم اقلیت اسلام کی دی ہوئی امان میں ہیں۔“ (1)

دار الحرب کے حوالے سے ڈاکٹر عبد الوہاب خلاّف لکھتے ہیں:

”دار الحرب وہ علاقہ ہے جہاں اسلامی احکام کا نفاذ نہ ہو اور وہاں کے باشندے (کسی اسلامی حکومت میں رہائش پذیر) مسلمانوں کی طرح امن میں ہوں۔“(2)

غیر مسلموں کی اقسام:

دارالاسلام سے باہر کے علاقے جن کو دار الحرب کے نام سے موسوم کیا گیا ان کے الگ احکام اور اس کے باشندوں کے لیے الگ الگ تفصیلات مدون کر دی گئی ہیں۔ اس کے لیے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ان غیر مسلموں کو مختلف زمروں میں تقسیم کیا گیا جو دار الحرب کے کسی علاقے میں آباد یا کسی علاقے میں فرمانروائی کے منصب پر فائز تھے۔ خود قرآن پاک نے سارے غیر مسلموں کو ایک ہی طبقے میں شامل قرار نہیں دیا، بلکہ قرآن مجید میں مختلف غیر مسلموں کے مختلف احکام دیئے گئے ہیں۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ سارے غیر مسلم ایک زمرے میں نہیں آتے۔ مثلاً قرآن پاک نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے زیادہ قریب قرار دیا اور مشرکین کو سب سے زیادہ بعید قرار دیا۔ پھر عرب کے مشرکین کو عام مشرکین کے مقابلہ میں اسلام نے زیادہ دور قرار دیا اور ان کے بارے میں کسی رعایت سے کام نہیں لیا۔

قرآن پاک میں بنیادی طور پر غیر مسلموں کی دو قسمیں قرار دی گئیں۔

مذہب کے اعتبار سے:

پہلی قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو اصلاً آسمانی مذاہب کی پیروی کے مدعی ہیں۔ یہ اہل کتاب ہیں جو اس اعتبار

---

[1] ۔ عبد الکریم زیدان ، احکام الذمیین و المستامنین فی دار الاسلام،ص:19

سے مسلمانوں کے قریب اور مسلمانوں کے مشابہ ہیں کہ وہ اپنی اپنی جگہ ان بنیادی تصورات اور عقائد کو کسی نہ کسی رنگ میں تسلیم کرتے تھے جن پر اسلام کی اساس ہے۔ مثلاً وہ توحید، نبوت، آخرت کو مانتے ہیں۔ وہ ان انبیاء کرام میں سے بیشتر کو مانتے ہیں جن کو قرآن نے بطور نبی تسلیم کیا ہے اور جن کے نام قرآن میں آئے ہیں۔ اس لیے غیر مسلموں کی اقسام میں سب سے پہلے انہیں رکھا گیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾[1]

" آپؐ ان سے کہیئے: اے اہل کتاب! ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مسلم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ ہی ہم میں سے کوئی شخص اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو رب بنائے اگر وہ اس بات سے منہ موڑیں تو ان سے کہئیے کہ: گواہ رہو کہ ہم تو اس کے فرمانبردار ہیں۔"

اہل کتاب کے بعد دوسرا درجہ ان غیر مسلموں کا رکھا گیا ہے جن کو فقہائے کرام نے شبہ اہل کتاب قرار دیا ہے۔

علامہ ابن قدامہ نے فرماتے ہیں:

"أَنَّ الْكُفَّارَ ثَلَاثَةُ أَقْسَامٍ؛ قِسْمٌ أَهْلُ كِتَابٍ، وَهُمْ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى، وَمَنْ اتَّخَذَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ كِتَابًا، كَالسَّامِرَةِ وَالْفِرِنْجِ وَنَحْوِهِمْ، فَهَؤُلَاءِ تُقْبَلُ مِنْهُمْ الْجِزْيَةُ......

وَقِسْمٌ لَهُمْ شُبْهَةُ كِتَابٍ، وَهُمْ الْمَجُوسُ فَحُكْمُهُمْ حُكْمُ أَهْلِ الْكِتَابِ، فِي قَبُولِ الْجِزْيَةِ مِنْهُمْ، وَإِقْرَارِهِمْ بِهَا؛ لِقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «سُنُّوا بِهِمْ سُنَّةَ أَهْلِ الْكِتَابِ)وَ لَا نَعْلَمُ بَيْنَ أَهْلِ الْعِلْمِ خِلَافًا فِي هَذَيْنِ الْقِسْمَيْنِ.

وَقِسْمٌ لَا كِتَابَ لَهُمْ، وَلَا شُبْهَةَ كِتَابٍ، وَهُمْ مَنْ عَدَا هَذَيْنِ الْقِسْمَيْنِ، مِنْ عَبَدَةِ

---

[1] ۔ آل عمران 3: 64

الْأَوْثَانِ"[1]

"کفار کی تین قسمیں ہیں ایک قسم: یہود و نصاریٰ اور وہ لوگ ہیں جو تورات و انجیل کو کتاب الٰہی مانتے ہیں جیسے سامرہ، فرنج اور ان جیسے دیگر لوگ، پس ان سے جزیہ وصول کیا جائے گا۔ کفار کی دوسری قسم شبہ اہل کتاب ہے اور یہ مجوسی ہیں ان سے جزیہ قبول کیا جاتا ہے اور اپنے دین پر قائم رہتے ہیں ان کا حکم اہل کتاب جیسا ہو گا جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی (مجوسیوں کے ساتھ وہی طرز عمل اختیار کرو جو تم اہل کتاب کے ساتھ رکھتے ہو) اور ہمیں نہیں معلوم کہ اہل علم میں سے کسی نے ان دو قسموں میں کسی طرح کا اختلاف کیا ہو۔ اور تیسری قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کی کوئی کتاب نہیں اور نہ ان کے احکام اہل کتاب جیسے بیان ہوئے ہیں اور وہ ان دونوں قسموں کے علاوہ تمام کفار ہیں۔"

یعنی وہ غیر مسلم جو بعض اعتبارات سے اہل کتاب کے مشابہ تھے۔ ایسے غیر مسلموں سے مسلمانوں کا واسطہ رسول اللہ ﷺ ہی کے عہد مبارک میں پڑ چکا تھا۔ 9 ہجری میں جب پہلی بار بحرین کے لوگ اسلام قبول کر کے مدینہ حاضر ہوئے اور حضور ﷺ سے گفتگو کی تو اس میں انہوں نے پوچھا کہ ہمارے علاقے میں مجوسی اور آتش پرست بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ آپؐ نے فرمایا: "سُنُّوا بِهِمْ سُنَّةَ أَهْلِ الْكِتَابِ" مجوسیوں کے ساتھ وہی معاملہ اور طرز عمل رکھو جو اہل کتاب کے ساتھ رکھتے ہو۔

چنانچہ جب حضرت عمر فاروق کے زمانے میں جب ایران کے آتش پرستوں اور زرتشتوں سے معاملہ پیش آیا تو اس وقت بھی صحابہ کرامؓ نے یہی طے کیا کہ ایران کے آتش پرستوں کی حیثیت بھی شبہ اہل کتاب کی سی ہو گی۔

أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ذَكَرَ الْمَجُوسَ فَقَالَ مَا أَدْرِي كَيْفَ أَصْنَعُ فِي أَمْرِهِمْ فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ أَشْهَدُ لَسَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ سُنُّوا بِهِمْ سُنَّةَ أَهْلِ الْكِتَابِ»[2]

" حضرت عمر بن خطاب نے مجوس کا ذکر کیا اور کہا کہ میں نہیں جانتا ان کے بارے میں کیا کروں تو عبد الرحمن بن عوفؓ نے کہا میں گواہی دیتا ہوں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا انہوں نے

---

[1] ۔ابن قدامه ،عبد الله بن احمد ، المغنى، ، دارالفكر ، 1505ھ، بيروت 9: 173

[2] ۔ مالك بن انس ، المؤطا، ، دار احياء التراث العربى، بيروت، حديث:616

فرمایا:"ان سے وہ طریقہ برتو جو اہل کتاب سے برتتے ہو"۔

گویا یہ ایک درمیانہ درجہ ہے جو اہل کتاب اور عام کفار ومشرکین کے بین بین ہے۔[1]

اس کے بعد عام کفار کی حیثیت ہے، خواہ وہ بت پرست ہوں یا مشرک ہوں، لیکن کسی نہ کسی مذہب کے قائل ہوں اور کسی نہ کسی رنگ میں خدائے بزرگ وبرتر کے ماننے والے ہوں۔[2]

اس کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہے جو سرے سے کسی خدا کے وجود کے قائل نہیں۔ یا تو بالکل دہریہ ہیں یا فطرت پرست ہیں اور مذہب کو سرے سے مانتے ہی نہیں۔[3]

سب سے آخری درجہ مشرکین عرب کا ہے، یعنی حضور نبی اکرم ﷺ کی وہ قوم جن کو آپؐ نے براہ راست اپنی زبان اقدس سے دین کی دعوت دی اور انہوں نے اس کو مسترد کر دیا۔ ان کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ ان تین متبادل رویوں سے ایک رویہ اپنے لیے اختیار کر لیں: یا تو وہ اسلام قبول کر لیں، یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں یا پھر جزیرہ عرب کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ یہ سختی اس لیے روا رکھی گئی کہ جزیرہ عرب کو اسلام کا مرکز حسی اور روحانیت اسلام کا محور بنانا مطلوب تھا۔ اللہ کی مشیت میں یہ طے کر دیا گیا تھا کہ اب جزیرہ عرب صرف اور صرف دین اسلام کا مرکز ہو گا اور وہاں دوسرے غیر اسلامی اور لا دینی نظریات ومذاہب کو باقی رہنے کی اجازت نہ ہو گی۔

سیاسی تعلقات کے اعتبار سے:

یہ دوسری تقسیم غیر مسلم اقوام کی مسلمانوں کے ساتھ بالفعل تعلقات کی نوعیت پر ہے کہ ان کے مذہب اور فکر میں مسلمانوں کے بارے میں کیا طرز عمل پایا جاتا ہے۔ اس کے لیے پھر کئی ذیلی تقسیمات ہیں:

معاہدین:

وہ لوگ ہیں جن کے مسلمانوں کے ساتھ معاہدات اور طے شدہ شرائط کے تحت تعلقات کی نوعیت واضح طور پر طے ہو گئی ہو۔ جس میں دونوں فریقوں کے حقوق اور ذمہ داریاں طے کر لی گئی ہیں اور اقلیت ہونے کی حیثیت سے غیر مسلموں کے اور اکثریت ہونے کے لحاظ سے مسلمانوں کے حقوق وفرائض کا واضح طور پر تعین کر لیا گیا ہو

---

[1]۔ بیہقی، احمدبن حسین ، السنن الکبری، (مکه مکرمه،دار الباز ، 1994ء)،حدیث:18434

[2]۔ ابن قدامه ،عبد الله بن احمد ، المغنی،9: 173

[3]۔ عبد الکریم زیدان ، احکام الذمیین ،ص:16

۔اور معاہدہ کے ذریعے فریقین کی ذمہ داریاں طے کرلی گئی ہیں، ایسے لوگوں کو فقہاء نے معاہدین کی اصطلاح سے موسوم کیا ہے، یعنی جن کا مسلمانوں سے کوئی معاہدہ ہو چکا ہے اور اس معاہدہ میں فریقین کے فرائض اور ذمہ داریاں طے کرلی گئی ہوں۔

معاہدین کے ساتھ تعلقات کی نوعیت براہ راست سنت نبوی ﷺ سے متعین ہے۔ چنانچہ معاہدین کے اموال کو آپ ﷺ نے مسلمانوں پر حرام قرار دیا۔ حضرت خالد بن ولید سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«ألا لا تحل أموال المعاهدين إلا بحقها»[1]

"آگاہ رہو کہ معاہدین کے اموال (مسلمانوں کے لیے) حلال نہیں سوائے جائز حق کے۔"

آپ ﷺ نے معاہدین کی دیت مسلمانوں کے برابر قرار دی ہے۔روایت میں ہے:

«جعل رسول الله ﷺ دية المعاهدين دية المسلم»[2]

"حضور نبی اکرم ﷺ نے معاہدین کی دیت کو مسلمانوں کی دیت کے برابر قرار دیا۔"

معاہد کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ وہ اپنے علاقے میں اپنے دین کے حوالے سے جو چاہے کرے۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں:

"فان المعاهد له أن يظهر فى داره ما شاء من امر دينه"[3]

"معاہد اپنے گھر میں دینی امور سرانجام دے سکتا ہے۔"

اہل ذمہ:

دوسرا درجہ ان اہل ذمہ کا جو کسی مفتوحہ علاقہ کے غیر مسلم باشندے ہوں، وہ علاقہ اسلام نے فتح کرلیا ہو اور وہاں کے رہنے والوں نے اپنے مذہب پر قائم رہنا پسند کیا ہو اور وہ اس فتح کے نتیجہ میں اسلامی ریاست

---

[1]۔ ابو داؤد ، سليمان بن اشعث ، ،المكتبه الاثريه، بيروت ،السنن ، كتاب الاطعمة ، باب فى لحوم الحمر الاهلية،حديث:3806

[2]۔ بيهقى، احمدبن حسين ، السنن الكبرى،حديث:16350

[3]۔ابن قيم ،محمدبن ابى بكر ، احكام اهل الذمة ، ، دار العلم للملايين، 1961ء، بيروت، 816:2

کے شہری بن گئے ہوں۔

علامہ ابن قیم اس کا اصطلاحی معنی یوں بیان کرتے ہیں:

"وَلَكِنْ صَارَ فِي اصْطِلَاحِ كَثِيرٍ مِنَ الْفُقَهَاءِ " أَهْلُ الذِّمَّةِ"عِبَارَةً عَمَّنْ يُؤَدِّي الْجِزْيَةَ، وَهَؤُلَاءِ لَهُمْ ذِمَّةٌ مُؤَبَّدَةٌ، وَهَؤُلَاءِ قَدْ عَاهَدُوا الْمُسْلِمِينَ عَلَى أَنْ يَجْرِيَ عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللَّهِ وَرَسُولِهِ، إِذْ هُمْ مُقِيمُونَ فِي الدَّارِ الَّتِي يَجْرِي فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ وَرَسُولِهِ"[1]

"لیکن اکثر فقہاء کے نزدیک اصطلاحاً اہل ذمہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے حقوق کی پاسداری حکومت پر ہمیشہ لازم ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ اس چیز کا معاہدہ کیا ہوتا ہے کہ ان پر اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے دیئے ہوئے قوانین کا اجراء کیا جائے درآنحالیکہ وہ ایسے علاقے میں رہائش پذیر ہوتے ہیں جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔"

اہل صلح:

یہ وہ لوگ ہیں جن سے کوئی جنگ ہو رہی ہو اور جنگ کے کسی واضح نتیجہ پر پہنچنے سے قبل اس کے اختتام سے پہلے ہی ان سے کوئی مستقل یا عارضی مصالحت ہوگئی ہو اور فریقین کے درمیان جنگ بندی ہوگئی ہو۔ صلح کی شرائط پر ان سے معاملات طے کئے گئے ہوں۔

صلح کا معنی یوں بیان کیا گیا ہے:

"الصلح: هو فی اللغة اسم من المصالحة، وهی المسالمة بعد المنازعة، وفي الشريعة عقد يرفع النزاع"[2]

"باعتبار لغت صلح مصالحت کا اسم ہے اس کا معنی جھگڑے کے بعد ثالثی ہے۔ شریعت میں وہ معاہدہ جس سے نزاع ختم ہو صلح کہلاتا ہے۔"

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

---

[1]۔ ابن قیم ،محمدبن ابی بکر ، احکام اهل الذمة ، 2 :475۔476

[2]۔الشرباصی،الدکتور، احمد ، المعجم الاقتصادی الاسلامی، دار الجیل، بیروت ، 1981ء،ص: 256

"و أهل دار الحرب هم الحربيون: والحربی لاعصمة فی نفسه ولا فی ماله بالنسبة لأهل دار الاسلام لأن العصمة فی الشريعة الاسلامية تكون بأحد الامرين الايمان او الامان وليس للحربی واحد منهما"[1]

"دارالحرب میں رہنے والے لوگ حربی ہیں، دار الاسلام میں رہنے والوں کی طرح دار الحرب کے باشندوں کی جان ومال کی عصمت نہیں ہوتی، کیونکہ شریعت میں عصمت دو سبب سے حاصل ہوتی ہے ایمان یا طلب امان سے اور حربی کے پاس یہ دونوں چیزیں مفقود ہوتی ہیں۔"

ان سب قسموں کے ساتھ معاشرت کے الگ الگ احکام ہیں۔ ان میں سے بعض کے احکام قرآن پاک میں دیئے گئے ہیں اسی طرح بعض احکام احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمادیے۔

حالت جنگ میں غیر مسلموں سے معاشرت:

حالت جنگ میں جن لوگوں سے جنگ ہو رہی ہو ان سے تعلقات کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ ان سے لین دین، میل جول اور تعلقات کے احکام میں تبدیلی آجاتی ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کافروں کے ساتھ حالت جنگ کی وجہ سے ان لوگوں سے بھی تعلقات بدل جائیں گے جن کے ساتھ باقاعدہ پر امن اور معمول کے تعلقات کی نوعیت پہلے سے طے ہے۔ بلکہ معاہدین، اہل صلح، اہل ذمہ اور جو مستامن سے وہ ہی طے شدہ معاملات رہیں گے۔ البتہ جن لوگوں سے جنگ پیش آگئی ان کے معاملات کی نوعیت جنگ کی نوعیت اور صورتحال کے مطابق ہو گی۔ ان میں ایک تو وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ براہ راست جنگ ہو رہی ہو اور ان سے حالت جنگ جاری ہو۔ چاہے بالفعل کسی قسم کی معرکہ آرائی ہو رہی ہو یا نہ ہو رہی ہو۔ یہاں جنگ ہونے اور حالت جنگ کے جاری ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ دونوں فریقین کی فوجیں بالفعل برسرپیکار ہوں۔ بلکہ اس سے مراد محض نظری جنگ ہے، اس میں کبھی چھوٹی موٹی جھڑپیں ہو جاتی ہیں اس حالت جنگ کے دوران اس ملک کے وہ لوگ جو جنگ کرنے آئے ہوں یا کسی بھی حیثیت سے جنگ میں حصہ لے رہے ہوں ان کے احکام الگ ہیں اور وہ حربی یا اہل حرب کہلاتے ہیں۔[2]

---

[1]- عبد الكريم زيدان ، احكام الذميين ،ص:20

[2]- ابن حزم، على بن احمد د،المحلى، دار الآفاق الجديد، بيروت ،س ن، 11: 97۔ 108

اسلامی ریاست کے اندر محاربین کا معاملہ:

ایک قسم ان محاربین کی ہے جو دار الاسلام کے باشندے ہوں اور بغیر کسی بنیاد کے جائز اور قانونی حکومت کے خلاف ہتھیار لے کر کھڑے ہو گئے ہوں۔ یہ محاربین مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مسلم بھی۔ یہ لوگ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، لیکن ایک چھوٹے گروہ کی صورت میں حکومت وقت سے ٹکرا رہے ہوں اور امن وامان کا مسئلہ بن رہے ہوں اور لوگوں کی جان ومال کے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہوں۔

محارب بارے ابن حزم ایک روایت نقل کرتے ہیں:

عَنْ الْحَكَمِ بْنِ عَطِيَّةَ قَالَ: سَأَلْت الْحَسَنَ عَنْ رَجُلٍ ضَرَبَ رَجُلًا بِالسَّيْفِ بِالْبَصْرَةِ؟ قَالَ: كَانُوا يَقُولُونَ: مَنْ شَهَرَ السِّلَاحَ فَهُوَ مُحَارِبٌ»[1]

”حکم بن عطیہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت حسنؒ سے ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا جس نے بصرہ میں کسی کو تلوار ماری۔ تو انہوں نے کہا: وہ کہا کرتے تھے کہ جس نے اسلحہ اٹھایا وہ محارب ہے۔“

اس طرح کے لوگوں کے لیے شریعت میں الگ قوانین واحکام دیئے گئے ہیں جو ایک طرف اسلام کے داخلی (میونسپل) احکام کا جز ہیں اور ایک اعتبار سے اسلام کے انٹر نیشنل لاء کا حصہ ہیں۔ اس صورت کو دونوں حیثیتوں سے زیر بحث لایا گیا ہے اور قانون کے دونوں شعبوں کے ضمن میں اس کو بیان کیا گیا ہے۔

مرتدین سے معاشرت:

مرتدین کے اکثر احکام حضرت ابو بکر صدیق کے طرز عمل کی بنیاد پر مرتب کئے گئے ہیں۔ یہاں یہ واضح رہے کہ بعض اوقات مرتدین محاربین کی حیثیت بھی اختیار کر سکتے ہیں اور اس صورت میں ان پر دونوں قسم کے قوانین حسب ضرورت لاگو ہوں گے۔

فقہاء اسلام نے قانونی اعتبار سے تفصیلاً مرتد کے احکام مرتب کئے ہیں۔، چنانچہ ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:

"والمرتد فی اللغة الراجع مطلقاً و فی الشريعة الراجع عن دين الاسلام"[2]

1۔ ایضا، 274:12

2۔ ابن نجيم، زين بن ابراہيم ، البحر الرائق شرح كنز الدقائق، دار المعرفة، بيروت ، 129:5

"لغت میں مرتد مطلقاً پھرنے والے کو کہتے ہیں، شرعاً مرتد سے مراد وہ شخص ہے جو دین اسلام سے پھر گیا ہو۔"

غیر مسلموں سے حسن معاشرت کی مثالیں:

بنو تغلب ایک بڑا با اثر اور جنگجو عیسائی قبیلہ تھا جو اپنی کثرت تعداد کے علاوہ سیاسی اور عسکری قوت بھی رکھتا تھا۔ یہ قبیلہ عراق اور شام کی سرحدوں پر آباد تھا۔ اس طرح کچھ با اثر عرب قبائل عراق کی سرحد پر بھی آباد تھے۔ بنی تغلب سے حضرت عمر فاروق کے دور میں ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ شرط بھی موجود تھی کہ یہ عیسائی مذہب پر قائم رہیں گے اور ان کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ یہ جزیہ یا خراج ادا نہیں کریں گے، لیکن جو جو ٹیکس مسلمان ادا کرتے ہیں وہی ٹیکس دوگنی شرح سے یہ ادا کریں گے۔ مسلمان زکوٰۃ ادا کریں گے، البتہ جہاں مسلمان چالیسواں حصہ ادا کرتے ہیں وہاں یہ بیسواں حصہ ادا کریں گے۔ جہاں مسلمان چالیس بکریوں پر ایک بکری ادا کرتا ہے یہ چالیس بکریوں پر دو بکریاں ادا کریں گے۔[1]

بہر حال بنی تغلب سے یہ معاہدہ طے پا گیا۔ اس معاہدے میں یہ بھی طے ہوا کہ یہ اپنی آئندہ نسلوں کو عیسائی بننے پر مجبور نہیں کریں گے، لیکن انہوں نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی اور معاہدے کے برعکس یہ لوگ اپنی اولادوں کو خاموشی سے عیسائی بنانے پہ مجبور کرتے رہے۔ معاہدے میں یہ بھی طے ہوا تھا کہ کوئی مسلمان ان کی بستیوں میں بغیر اطلاع کے نہیں جائے گا اور نہ ہی وہاں ٹھہرے گا۔

اسی طرح نجران کے عیسائیوں کے ساتھ ایسا ہی ایک معاہدہ خود رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ اس معاہدہ میں ان شرائط کے بارے میں ایک قاعدہ کلیہ اور قانون کا ایک بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے جس کو ابو عبید نے ان الفاظ میں محفوظ رکھا ہے:

"فھؤلاء علی شروطھم ،لا یحال بینھم و بینھا"[2]

"یعنی یہ لوگ اپنی شرائط پر باقی رہیں گے اور ان شرائط اور ان لوگوں کے درمیان کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔"

---

[1]۔ ابن سلام ، ابو عبید القاسم ،کتاب الاموال ، مکتبہ الاثریہ، شیخوپورہ ،ص:28

[2]۔ ایضا ، ص:101

جو بھی شرائط ایک بار طے ہو گئی ہیں ان کی مکمل پاسداری کی جائے گی۔ اس معاہدے پر خواہ ہزار سال گزر جائیں معاہدے کی پابندی کی جائے گی۔

جن جن لوگوں سے اس نوعیت کے معاہدے کئے گئے بالخصوص رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں ان میں خاصی تعداد میں ایسے معاہدے ہیں کہ جن میں غیر مسلموں پر کوئی جزیہ عائد نہیں کیا گیا۔

غیر مسلموں کی جان ومال اور عزت و آبرو کا مکمل تحفظ:

جزیہ کے لفظی معنی ہیں معاوضہ اور بدلہ۔ انگریزی میں اس کے لیے Consideration کی اصطلاح اختیار کی جاسکتی ہے۔ یعنی کچھ دے کر اس کے مقابل کچھ لینا۔ اہل لغت نے جزیہ اور جزاء کو ہم معنی قرار دیا ہے۔

"والجِزْيَةُ، بالكسرِ: خَراجُ الأرضِ، وما يُؤْخَذُ من الذِّمِّيِّ"[1]

"اور جزیہ (زیر کے ساتھ) زمین کا خراج ہے اور وہ (ٹیکس) ہے جو ذمی سے لیا جاتا ہے۔"

اسلامی ریاست غیر مسلموں کو جان ومال اور عزت و آبرو کا مکمل تحفظ فراہم کرتی ہے۔ اس تحفظ اور ان حقوق کے معاوضے میں جو اسلامی ریاست کی طرف سے ان کو مل رہے ہیں ان سے ایک خصوصی ٹیکس لیا جاتا ہے جس کو جزاء یا جزیہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ لہٰذا جس طرح اس تحفظ کے مقابلے میں غیر مسلموں سے جزیہ لیا جاتا ہے اسی طرح مسلمانوں سے زکوٰۃ لی جاتی ہے۔ شرعاً زکوٰۃ اور جزیہ دو مستقل ٹیکس ہیں جو اسلامی ریاست اپنے شہریوں سے وصول کرتی تھی۔ ان کے علاوہ جتنے بھی ٹیکس تھے وہ وقتی اور عارضی نوعیت کے ہوتے تھے۔ جب ضرورت ہوتی عائد کر دیے جاتے اسی طرح بوقت ضرورت ختم کر دیے جاتے۔ پھر وہ حالات اور ماحول کے بدلنے سے بدلتے اور گھٹتے اور بڑھتے رہتے تھے، لیکن جزیہ اور زکوٰۃ کی حیثیت مستقل نوعیت کی تھی۔

ان میں جزیہ کے مقابلے میں زکوٰۃ کے احکامات نسبتاً سخت تھے۔ جزیہ میں پابندیاں کم تھیں۔ مثلاً بعض صورتیں ایسی تھیں کہ جن میں غیر مسلموں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔[2]

اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم اپنی خدمات ریاست کے لیے رضاکارانہ طور پر پیش کرتا ہے تو ان خدمات کے

---

[1] ۔ فیروز آبادی، محمد بن یعقوب ، القاموس المحیط ، دارلجیل ، بیروت ، 4: 314

[2] ۔ عبد الکریم زیدان، احکام الذمیین، ص:149

اعتراف کے طور پر اس کا جزیہ معاف کیا جاسکتا ہے۔

قرآن و سنت نے اس کو بھی ہر حال اور ہر صورت میں لازمی قرار نہیں دیا ہے۔ یہ حکومت کی صوابدید اور انتظامی و سیاسی مصالح کی بنیاد پر طے ہوتا ہے پھر اس جزیہ کی کوئی مقدار شریعت میں متعین نہیں ہے۔ جو اصول شریعت نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ جزیہ ان کی استطاعت کے مطابق ہو، جو غیر مسلم کمانے اور فوجی خدمت انجام دینے کا اہل ہو اس پر بقدر استطاعت جزیہ عائد کیا جائے اور اسی اصول کے مطابق عہد نبویؐ، عہد خلفائے راشدینؓ اور مابعد کے تمام ادوار میں عمل کیا گیا۔

جزیہ کی نوعیت کا جو بھی ٹیکس نافذ کیا گیا وہ ان غیر مسلموں کی مالی استطاعت کو مد نظر رکھ کر نافذ کیا گیا ہے، مثال کے طور پر یمن کے علاقے نجران میں کپڑا بننے والوں کا بڑا زور تھا۔ ان سے کہا گیا کہ جو کپڑا بنائیں اس میں سے دے دیا کریں۔ پورا علاقہ جو کئی ہزار مربع میل رقبہ پر مشتمل تھا اور جہاں متعدد قبائل آباد تھے جہاں سے پورے عرب میں کپڑا جایا کرتا تھا ان سے صرف یہ مطالبہ کیا گیا کہ سالانہ کپڑا بطور جزیہ دے دیا کریں۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو مویشی پالنے کا کام کرتے تھے ان سے مویشیوں کا جزیہ طے کر دیا گیا کہ فی کس سالانہ یہ تعداد ہو گی۔ بعض قبائل سے طے کیا گیا کہ پورا قبیلہ سال میں اتنے مویشی دے گا۔

حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ انہیں حکم دیا:

«أَنْ يَأْخُذَ مِنْ كُلِّ حَالِمٍ يَعْنِي مُحْتَلِمًا دِينَارًا أَوْ عَدْلَهُ مِنْ الْمَعَافِرِ ثِيَابٌ تَكُونُ بِالْيَمَنِ»[1]

" ہر بالغ مرد سے ایک دینار لینے کا یا اس کے بدلہ میں معافر یعنی یمن کے بنے ہوئے کپڑے لینے کا حکم فرمایا۔"

جزیہ کے باب میں فقہائے کرام کے مابین ایک نظری سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ جزیہ جو لیا جاتا ہے یہ کس چیز کا بدل ہے۔؟ بعض فقہاء نے کہا کہ ریاست میں پر امن اور محفوظ طور پر رہنے کا معاوضہ ہے۔ بعض نے کہا کہ دشمن کی حیثیت سے میدان جنگ میں ان کو قتل کیا جاسکتا تھا، لیکن فتح کے باوجود ان کی جان بخشی کر دی گئی یہ اس جان بخشی کا معاوضہ ہے۔ یہ مباحث فقہائے کرام کے ہاں طویل عرصہ تک جاری رہے، لیکن بالآخر اس بات پر

---

[1]۔ ابوداؤد، السنن، کتاب الجزیہ، باب فی اخذ الجزیہ، حدیث:3038

فقہائے کرام نے اتفاق کیا کہ یہ اس تحفظ یا مراعات کا معاوضہ ہے جو اسلامی ریاست انہیں دیتی ہے۔ اسی بناء پر قاعدہ کلیہ بنایا گیا کہ ٹیکس اسی وقت لیا جاسکتا ہے جب ریاست باشندوں کو تحفظ فراہم کرے۔ اگر تحفظ فراہم نہ کیا گیا ہو تو ریاست کو ٹیکس لینے کا کوئی حق نہیں۔[1]

غیر مسلموں کے ایسے افراد جو دشمن کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوتے مثلاً راہب، گوشہ نشیں، بچے، بوڑھے، عورتیں، بیمار، معذور وغیرہ انہیں ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے، اسلام نے ٹیکسوں کا جو نظام دیا ہے وہ نہ ظالمانہ ہے اور نہ عوام کا استحصال کرتا ہے، بلکہ عدل کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے یہ نظام ایک فلاحی ریاست میں شہریوں کی تمدنی زندگی میں انہیں آسودگیاں فراہم کرتا ہے اور ان آسودگیوں کی فراہمی میں مسلم و غیر مسلم کی تفریق روا نہیں رکھتا۔ یہاں تک کہ ذمیوں کے حقوق کی نگہداشت کا حکم تاکیداً اور بار بار آیا ہے۔[2]

ذمیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا تحفظ کیا جاسکے یا نہ کیا جاسکے ان کو زکوٰۃ معاف نہیں کی جاسکتی، لیکن غیر مسلموں سے اگر جزیہ لے لیا گیا ہو، لیکن بعد ازاں تحفظ فراہم نہ کیا جاسکے تو وہ ادا شدہ جزیہ واپس انہیں لوٹا دیا جائے گا۔ جیسا کہ حمص میں سیدنا ابو عبیدہ نے واپس کر دیا تھا۔ پہلے انہوں نے حمص فتح کیا اور وہاں کے باشندوں سے معاہدہ طے ہو گیا جس کے بموجب جزیہ کی وصولی شروع ہو گئی، لیکن بعد میں عسکری صورت حال ایسی ہو گئی کہ باشندگان حمص کا تحفظ دشوار ہو گیا اور عسکری ضرورت سے حضرت ابو عبیدہؓ کو حمص شہر خالی کرنا پڑا جس کے نتیجے میں سیدنا ابو عبیدہؓ نے سارا اصول شدہ جزیہ ایک ایک فرد کو واپس کر دیا۔[3]

حضرت عمر فاروق کا مشہور واقعہ ہے۔ آپؓ نے دیکھا کہ ایک بوڑھا یہودی مدینے میں بھیک مانگ رہے۔ آپؓ نے پوچھا: بھیک کیوں مانگ رہے ہیں؟ اس نے جواب دیا: میں یہودی ہوں اور جزیہ ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں، اس لیے بھیک مانگ رہا ہوں۔ ممکن ہے اس یہودی نے جھوٹ ہی بولا ہو اور حضرت عمر کی شہرہ آفاق عدل و رحمت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے یہ عذر موقعہ پر ہی گھڑ لیا ہو، لیکن انہوں نے کوئی تحقیق نہیں کی۔ اس کو ساتھ لے کر اسی وقت بیت المال کے انچارج کے پاس گئے اور کہا کہ یہ ظلم ہے کہ جب یہ جوان تھا تو اس نے جزیہ

---

[1]۔ عبد الکریم زیدان ، احکام الذمیین ،ص:154

[2]۔ قاضی ابویوسف ،یعقوب بن ابراہیم ، کتاب الخراج،مکتبہ بولاق، القاہرہ 1302ھ،ص:150

[3]۔ ایضا، ص:136

دیا اور اب یہ بوڑھا ہو گیا ہے تو ہم اس کو یوں بے سہارا چھوڑ دیں؟ آج سے اس کے لیے بیت المال سے وظیفہ جاری کر دو۔ پھر حکم دے دیا گیا کہ بیت المال سے ہر اس غیر مسلم کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے جو کمانے کے قابل نہیں ہے۔[1]

ایک شرط یہ ہے کہ عاقل بالغ ہونے کے ساتھ ساتھ جزیہ ادا کرنے والا غیر مسلم مالی استطاعت بھی رکھتا ہو ورنہ اس سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح ٹیکس اس شخص پر عائد ہو گا جو جنگی خدمات انجام دے سکتا ہو، اس لیے غیر مسلم عورتوں پر یہ ٹیکس نہیں ہے۔ بچے اس سے مستثنیٰ ہیں اور جسمانی طور پر نااہل اور کمزور افراد بھی مستثنیٰ ہیں۔[2]

جب حضرت خالد بن ولید نے عراق و عرب کے درمیان کا علاقہ فتح کیا تو وہاں کے لوگوں سے ایک معاہدہ کیا۔ اس میں یہ شرط رکھی کہ جو شخص کمزور اور مریض ہو گا اسے بیت المال سے وظیفہ دیا جائے گا اور اس پر ٹیکس عائد نہیں ہو گا۔ یہ معاہدہ جب منظوری کے لیے مرکز بھیجا گیا تو حضرت عمر فاروق نے اسے منظور کیا اور آئندہ کے لیے طے کیا کہ نادار اور مریض غیر مسلموں کو بیت المال سے وظیفہ دیا جائے گا۔

ایک سوال فقہاء نے یہ بھی اٹھایا کہ اگر کوئی غیر مسلم جماعت یا گروہ یہ مطالبہ کرے کہ فلاں فلاں شرائط پر وہ جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیئے جائیں۔ مثلاً یہ کہ اگر وہ فوجی خدمات سرانجام دیں تو ان کا جزیہ ختم کیا جائے تو اس مطالبہ کو قبول کرنے سے حکومت وقت انکار نہ کرے گی، اس پر بیشتر فقہاء کا اتفاق ہے اور کوئی قابل اختلاف نہیں پایا جاتا۔

فقہ اسلامی کی رو سے اسلامی ریاست میں شہریوں کو جو حقوق حاصل ہوتے ہیں وہ دو بنیادوں پر یا ان میں سے ایک پر حاصل ہوتے ہیں۔

اشتراک دین

اشتراک دار (علاقہ)

یعنی یا تو شہریوں اور ریاست کے درمیان دین اور علاقہ (دار) دونوں کا اشتراک ہو یا کم سے کم ان میں سے کوئی

1۔ قاضی ابویوسف، کتاب الخراج، ص:132۔ 133

2۔ ابن قیم، محمد بن ابی بکر، احکام اهل الذمة، 57:1

ایک چیز مشترک ہو ان میں سے دین کا اشتراک دائمی ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ کچھ عرصہ کے لیے کوئی شخص مسلمان ہو جائے اور بعد میں اسلام سے پھر جائے۔ اشتراک اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہ غیر مسلم خود ہی اس کو ترک Repudiate نہ کر دے۔ لہٰذا غیر مسلم کے حقوق میں یک طرفہ طور پر تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔

جب کوئی غیر مسلم اسلام میں داخل ہو جائے جس دن اسلام میں داخل ہو گا جزیہ کے تمام سابقہ واجبات ختم ہو جائیں گے۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ومن اسلم سقطت عنه الجزية سواء أسلم فى اثناء الحول أو بعده"([1])

"جب کوئی غیر مسلم اسلام قبول کر لے تو اس سے جزیہ ساقط ہو جائے گا خواہ وہ دوران سال یا اس کے بعد ہی مسلمان ہو۔"

ٹیکس کے ختم ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ریاست جب غیر مسلم کو تحفظ دینے میں ناکام رہی ہو۔ جب ریاست تحفظ نہیں دے سکتی، چاہے یہ عدم تحفظ کسی بھی وجہ سے ہو، تو مسلمانوں سے تو ٹیکس لیا جائے گا اور زکوۃ وصول کی جائے گی، لیکن غیر مسلموں سے ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ جب تک کہ تحفظ کی ذمہ داری اسلامی ریاست پوری نہ کرے۔ حضرت خالد بن ولید کے ساتھ اہل حیرہ کا معاہدہ اسی قسم کا تھا۔ اس میں لکھا گیا

"ان منعناكم فلنا الجزية و الا فلاحتى نمنعكم" [2]

"اگر ہم تمہارا دفاع اور تحفظ کریں تو جزیہ ہمارا حق ہے ورنہ نہیں جب تک کہ ہم تمہارا دفاع نہیں کریں۔"

اس کی ایک مثال شام کی فتوحات کے سلسلے میں حضرت ابو عبیدہؓ کا طرز عمل ہے جب انہیں حمص سے دمشق جانا پڑا تو ذمیوں سے وصول شدہ کئی لاکھ کی رقم انہیں واپس کر دی کہ اب ہم آپ کی حفاظت کرنے سے قاصر ہیں۔ روایات میں مذکور ہے کہ مسلمانوں کے زیر حفاظت ان عیسائیوں اور یہودیوں پر اس طرز عمل کا زیادہ اثر ہوا

---

[1]۔ ابن قیم ، محمد بن ابی بکر ، احکام اهل الذمة، 176:1

[2]۔ عبد الكريم زيدان ، احكام الذمين ،ص:95

وہ روتے ہوئے دعا کرتے تھے کہ خدا مسلمانوں کو جلد واپس لائے، دنیا کی تاریخ حاکم اور محکوم کے درمیان ان لازوال انسانی رشتوں کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔[10]

یہ وہی چیز ہے جس کو حضرت عمر فاورق اور آپؓ کی شوریٰ نے باقاعدہ اصول کی شکل دے دی تھی۔

غیر مسلموں کے مذہبی معاملات

غیر مسلموں کو اپنے مذہبی اور قانونی معاملات پورے کرنے کی مکمل آزادی ہو گی۔ یہاں تک کہ اگر ریاست اپنی کسی مصلحت کے خلاف نہ سمجھے اور ریاست کے نظام میں خلل نہ پڑے تو غیر مسلموں کو اپنی عدالتیں قائم کرنے کی بھی آزادی ہے۔ کئی ممالک میں یہ حقوق غیر مسلموں کو دیئے گئے اور اس سے پہلے بنی عباس کے دور میں دیئے گئے۔ ان عدالتوں کے قاضیوں کی تنخواہیں سرکاری بیت المال سے ادا کی جاتی تھیں۔ ان عدالتوں کے فیصلوں کو ریاست بھی تسلیم کرتی تھی، چاہے وہ اسلامی قانون کے مطابق جائز ہو یا نہ ہو، بعض تابعین نے حضرت عمر بن عبد العزیز سے ذکر کیا کہ مجوسیوں کے ہاں خویزوگدس (یعنی نکاح محارم) جیسی قبیح رسم جاری ہے جو نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے تمام مذاہب و نظریات و اخلاق کے خلاف ہے، لہٰذا آپ اسے روکیں۔ آپ نے فرمایا جس چیز کو اسلام نے نہیں روکا میں اسے قانون کے زور سے کیسے روک دوں پھر جب ہم نے انہیں اور ان کی ثقافت اور پرسنل لاء کو تحفظ دیا ہے تو ہم اس میں مداخلت نہ کریں گے۔

غیر مسلموں کو دی جانے والی ان تمام آزادیوں کے ساتھ ساتھ ان پر دو پابندیاں بھی ہیں۔ ایک تو کسی غیر مسلم کو اسلامی ریاست کی حدود میں سود خوری کی اجازت نہیں دی گئی۔ دوسرے ایسے کاموں سے ان کو روکا گیا جن سے مسلم معاشرے کے اجتماعی اخلاق متاثر ہوتے ہوں اور اسلامی ثقافت کے امتیازی خصائص مجروح ہوتے ہوں مثلاً ان کو اپنے علاقے میں شراب پینے اور خنزیر کھانے کی اجازت ہے، لیکن مسلمانوں کی بستیوں میں کھلم کھلا شراب اور خنزیر فروخت کرنے سے روکا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ایسی مشترک بستیوں میں جہاں مسلمان اور غیر مسلم دونوں ملے جلے رہتے ہوں وہاں بھی ان امور پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ جن بستیوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو ان بستیوں میں بھی ایسے تمام کام اور اقدام ممنوع ہوں گے جو اسلام کے احکام کھلم کھلا خلاف ورزی پر

---

[1] ۔عبد الكريم زيدان ، احكام الذميين، ص:149

مبنی ہوں۔ اس اصول کا لحاظ رکھتے ہوئے غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے، حتیٰ کہ اپنے مذہب کی تبلیغ کی بھی آزادی ہے۔[1]

حالت امن میں غیر مسلموں کی آخری قسم جو اسلامی ریاست میں موجود ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے وہ مستامن کی ہے۔

مستامن کے لیے عام اصول یہی ہے کہ اس کے حقوق، مراعات اور ذمہ داریاں وہی ہیں جو ذمی کی ہیں، لیکن بعض معاملات میں مستامن کے الگ احکام بھی ہیں اسلامی ریاست میں عموماً مستامن کو وہ تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں جو آج کے دور میں سیاسی پناہ لینے والوں کو غیر ممالک میں ملتے ہیں۔[2]

ذمیوں سے معاشرت:

تمام اہل ذمہ (اقلیتیں) جو کسی بھی مسلمان حکومت کے شہری ہوں ان کے لیے فقہائے اسلام نے حقوق متعین کر دیئے ہیں۔ یہ حقوق درج ذیل ہیں:

شخصی آزادی:

کوئی بھی غیر مسلم جب کسی اسلامی حکومت کا شہری تسلیم کر لیا جائے تو پھر اسے نقل و حمل، سکونت، کسی بھی قسم کی زیادتی کے خلاف اپنی جان کی حفاظت کرنے ملک سے باہر جانے اور پھر واپس آنے کا حق ہے۔ اس پر کسی بھی قسم کی کوئی زیادتی روا نہیں رکھی جاسکتی جو شخصی آزادی کے منافی ہو۔

امام شافعی "کتاب الام" میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ کسی کو اہل ذمہ پر زیادتی کرنے سے بچائیں۔[3]

شرح السیر الکبیر میں ذمیوں کے بارے میں یہ ضابطہ بیان کیا ہے:

"أَنَّ الْمُسْلِمِينَ حِينَ أَعْطَوْهُمْ الذِّمَّةَ فَقَدْ الْتَزَمُوا دَفْعَ الظُّلْمِ عَنْهُمْ وَهُمْ صَارُوا

[1]۔ غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، خطبات بہاولپور، شریعہ اکیڈمی 2007ء، اسلام آباد، 2: 240

[2]۔ سرخسی، محمد بن احمد، شرح السیر الکبیر، 1: 145

[3]۔ الشافعی، محمد بن ادریس، الام، دار المعرفہ، 1410ھ، بیروت، 4:220

مِنْ أَهْلِ دَارِ الْإِسْلَامِ"[1]

"جب کسی غیر مسلم کو اسلامی ملک کی شہریت حاصل ہو جائے تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اسے ظلم سے بچائیں اس لیے کہ وہ شخصی آزادی کے معاملہ میں مسلمانوں کے برابر ہیں۔"

حضرت عمرؓ نے اپنے بعد والے حکمرانوں کو اقلیتوں کے بارے میں وصیت کی:

"لَا يُظْلَمُوا وَلا يُؤْذَوْا وَلا يُكَلَّفُوا فَوْقَ طَاقَتِهِمْ"[2]

"اقلیتوں پر نہ تو کسی قسم کی زیادتی کی جائے نہ ان کو ستایا جائے اور نہ ہی ان کو ان کی طاقت سے زیادہ کا مکلف ٹھہرایا جائے۔"

الماروردی نے 'الاحکام السلطانیہ' میں محتسب کے فرائض گنواتے ہوئے لکھاہے کہ اس پر یہ لازم ہے کہ اگر خدانخواستہ کوئی عاقبت نااندیش مسلمان کسی بھی اقلیتی فرد سے زیادتی کا مرتکب ہو تو وہ اسے سزا دے اور کسی بھی اقلیتی فرد سے زیادتی نہ کرے۔[3]

فقہائے اسلام نے اقلیتوں کی شخصی آزادی کو قائم اور برقرار رکھنے کے لیے کئی بار خلفاء اور عمال کو سرزنش بھی کی ہے جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

ایک دفعہ صالح بن عبد اللہ نے جبل لبنان کے عیسائیوں کو بغاوت کے جرم میں جلاوطنی کی سزا دی۔ حضرت امام اوزاعی کو اس کا علم ہوا اور یہ بھی خبر ملی کہ بغاوت تو چند آدمیوں نے کی تھی، لیکن سزا سب کو دے دی گئی ہے اس پر آپؒ نے صالح بن عبد اللہ کو ایک طویل خط لکھا جس میں فرمان رسول ﷺ کی روشنی میں انہیں ظلم کرنے سے روکا:

فانهم ليسوا بعبيد فتكون من تحويلهم من بلد الى بلد فى سعة ولكنهم احرار اهل الذمة[4]

"یہ لوگ غلام نہیں ہیں کہ ایک شہر سے دوسرے شہر مارے مارے پھریں بلکہ آزاد ہیں اور ان کی

---

[1] ۔ سرخسی ، امام ، محمد بن احمد، شرح السیر الکبیر ، 1: 145

[2] ۔ سلام ، ابو عبید القاسم، بن، کتاب الاموال ،ص:168

[3] ۔ الماوردی ، علی بن محمد بن حبیب، الاحکام السلطانیہ، دار الحدیث، القاہرہ،ص:227

[4] ۔ بن سلام ، ابو عبید القاسم ، کتاب الاموال ،ص220

آزادی حکومت کی ذمہ داری ہے۔"

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فقہائے اسلام غیر مسلموں کو کس نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔

کسی بھی اقلیتی شخص کو زبان، ہاتھ یا کسی دیگر طریقہ سے تکلیف پہنچانا مسلمانوں کے لیے بالکل ناجائز ہے، در مختار میں ہے:

"ویجب کف الاذی عنه وتحرم غیبته کالمسلم "[1]

" مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کو اقلیتی افراد کو تکلیف دینے سے باز رکھیں اور اس کی غیبت کرنا بالکل ویسا ہی گناہ ہے جیسا کہ کسی مسلمان کی غیبت کرنا گناہ ہے "۔

اس سے معلوم ہوتا ہے شخصی اعتبار سے وہ کسی طرح بھی مسلمانوں سے کم حقوق کے حق دار نہیں بلکہ مسلمانوں کے برابر کے حقوق کے مالک ہیں۔

تمدنی اور معاشرتی آزادی:

دار الاسلام کے اندر سوائے حرم کے وہ جہاں چاہیں سکونت اختیار کر سکتے ہیں اور اسی طرح ترک سکونت کا بھی انہیں اختیار ہے۔ حرم سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اور اس میں مشرک کے داخلہ پر پابندی نص سے ثابت ہے اس لیے وہ وہاں نہ رہ سکیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾[2]

"مشرک ناپاک لوگ ہیں لہٰذا اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائیں۔"

اسلام اگرچہ تمام ادیان سابقہ کی تصدیق کرتا ہے۔ اور اسلامی حکومت میں ان کے پیروکاروں کو مکمل آزادی ہے کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں۔ لیکن یہودیت اور عیسائیت کی طرح وہ اپنا دروازہ طالب ہدایت کے لیے بند نہیں کرتا بلکہ ہر وقت کھلا رکھتا ہے، جبکہ اسلامی حکومت کے زیر نگیں کسی بھی غیر مسلم کو مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اسلام قبول کرلے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾[1]

---

[1]۔ ابن عابدین، محمد امین ،الدر المختار، دارالفکر ، 1412ھ، بیروت ، 410:6

[2]۔التوبة 9 : 28

" دین (کے معاملہ) میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں بالکل واضح ہو چکی ہے۔"[1]

دارالاسلام میں اہل ذمہ کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنے عبادت خانے بنائیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ ان علاقوں میں اپنی عبادت گاہیں تعمیر کریں جہاں ان کی اکثریت ہو۔ تا کہ کسی قسم کے مذہبی اشتعال سے اندیشہ نقص امن پیدا ہی نہ ہو۔

اسلامی ریاست میں ضعیف و معذور غیر مسلموں کے حقوق:

جس طرح اسلامی بیت المال کسی مسلمان کے معذور ہونے یا بوجہ عمر رسیدگی اور غربت کے محتاج ہو جانے پر کفالت کی ذمہ داری لیتا ہے اسی طرح بیت المال پر ایک غیر مسلم کے معذور ہونے یا عاجز ہونے کی صورت میں اس کی کفالت لازم ہے۔

علامہ شبلی لکھتے ہیں:

" (حضرت عمر کے زمانے میں) عام حکم تھا اور اس کی ہمیشہ تعمیل ہوتی تھی کہ ملک کے جس قدر اپاہج، ازکاررفتہ، مفلوج وغیرہ ہوں سب کی تنخواہیں بیت المال سے مقرر کر دی جائیں، لاکھوں سے متجاوز آدمی فوجی دفتر میں داخل تھے جن کو گھر بیٹھے خوراک ملتی تھی، بلا تخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کے روزینے مقرر کر دیے جائیں" (2)

غرض حکومتی سطح پر جو معاشی مراعات مسلم معذورین کو حاصل تھیں، پوری رواداری کے ساتھ غیر مسلم معذور رعایا بھی نفع اندوز ہوتی تھی

عملی طور پر اس کی تاریخ اسلامی میں اور بہت سی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ غیر مسلم اقلیتوں کے معذور افراد کو اسلامی بیت المال سے باقاعدہ اچھا خاصا الاؤنس ملتا رہا ہے اس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ حقوق عامہ میں اسلامی حکومت کی نگاہ میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے اور بالکل برابر کے شہری ہیں۔

---

[1] ۔البقرہ 2 : 256

[2] ۔شبلی نعمانی، الفاروق، دارالاشاعت، کراچی، س ن، ص:286

نتیجۂ بحث

احکامات اسلام میں انسانی زندگی کے تمام تر پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے معاشرت کے اصول وضوابط باندھ دیے گئے ہیں۔ جہاں مسلم ریاست میں مسلم فرد کے حقوق کی بات کی گئی وہاں غیر مسلم اقلیتوں اور افراد کی حق تلفی پر سخت ترہیب بھی موجو ہے۔ تعلیمات اسلامیہ میں ایسے حالات میں زیر دست، ماتحت اور اقوام مخالفہ سے بہترین معاشرت کی تلقین ہے۔ اسلام غیر مسلم طبقات کے سیاسی، مذہبی، معاشی اور اخلاقی حقوق کی پاسداری مسلم حکمران کا فرض اور ذمہ داری ٹھہراتا ہے اور قرون اولی میں ہمیں اسلامی سلطنتوں میں ان اقدار کے عملی نفاذ کے بدرجہ نظائر دکھائی دیتے ہیں۔ اور اقوام عالم کے لیے اسلامی حکومت کے آداب معاشرت ایک نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی عملی نظیر کسی اور مذہب کے نام لیواؤں میں دکھائی نہیں دیتی۔